نظام خلافت وامارت کی
شرعی حیثیت



رحمۃ اللہ علیہ
مولانا عبد العلیم اصلاحی

مکتبۃ الاقصی





نظامِ خلافت وامارت

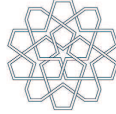
کی شرعی حیثیت

(۱۹۹۳ء)



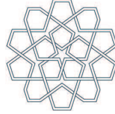
مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ

فہرستِ مضامین





تمہید



نظام خلافت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس موضوع پر گفتگو کیلئے بطور تمہید موجودہ عالمِ اِسلام کے ایک مستند عالمِ باعمل کے الفاظ مستعار لیتا ہوں۔

''اسلام صرف خواص کا مذہب نہیں ہے چند مختلف لوگوں کا اس پر عمل کرنا کافی نہیں اسی طرح اسلام عیسائیت کی طرح چند عقائد و رسوم کا نام نہیں۔ وہ زندگی کا نظام ہے وہ زمانہ کی فضا، طبیعت بشری کا مذاق اور سوادِ اعظم کا رنگ بدلنا چاہتا ہے اور عقائد کے ساتھ ساتھ اخلاق و معاشرت، زندگی کے مقصد و معیار، زاویہ نظر اور انسانی ذہنیت کو بھی اپنے قالب میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ یہ اسی وقت ہوسکتا ہے کہ اس کو مادی و سیاسی اقتدار حاصل ہو۔ صرف اسی کو قانون سازی اور تنفیذ کا حق حاصل ہو۔ اسی کے صحیح نمائندے دنیا کے لئے نمونہ ہوں۔ اسلام کے مادی اقتدار کا لازمی نتیجہ اس کا روحانی اقتدار اور صاحب اقتدار جماعت کے اخلاق و اعمال کی اشاعت ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ. (الحج:۴۱)

ترجمہ: یہ مسلمان وہ ہیں کہ اگر ہم نے زمین میں انہیں صاحب اقتدار کردیا ''یعنی ان کا حکم چلنے لگا تو'' وہ نماز قائم کریں گے ادائے زکوٰۃ میں سرگرم ہوں گے۔ نیکیوں کا حکم دیں گے۔ برائیوں سے روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ شرعی حکومت کے بغیر شریعت پر پورا عمل بھی نہیں ہوسکتا۔ اسلام کے نظام عمل کا ایک مستقل حصہ ایسا ہے جو حکومت پر موقوف ہے۔ حکومت کے بغیر قرآن مجید کا ایک پورا حصہ ناقابل عمل رہ جاتا ہے۔ خود اسلام کی حفاظت بھی قوت کے بغیر ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر اسلام کا پورا نظام مالی و دیوانی فوجداری

معطل ہو جاتا ہے اسی لئے قرآن غلبہ وعزت کے حصول پر زور دیتا ہے اور اسی لئے خلافت اسلامی بہت اہم اور مقدس چیز سمجھی گئی اور اس کو اکابر صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز وتکفین پر مقدم رکھا۔ جسے بہت سے کوتاہ نظر نہیں سمجھتے اور اسی کی حفاظت کے لئے حضرت حسینؓ نے اپنی قربانی پیش کی تاکہ اس کا مقصد ضائع نہ ہو اور نااہل ہاتھوں میں نہ جانے پائے۔'' (سیرت احمد شہیدؒ حصہ اول از: مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، صفحہ: ۵۱۵)

''اسلام کے پیش نظر جو عظیم مقاصد ہیں۔ان میں عبد ومعبود کے تعلق کی اصلاح وتعظیم پھر اس کی ترویج وتوسیع، انسانی زندگی کو اس کے قالب میں ڈھالنے کی سعی، افراد جماعت کے باہمی تعلقات کی استواری اور خوشگواری بھی ہے۔ایک ایسی شائستہ، خوش اسلوب، پرسکون اور پرُ امن زندگی کے لئے فضا ہموار کرنا بھی ہے جس میں خالق کے فرائض مخلوق کے حقوق دونوں کے ادا کرنے کا پورا موقع اور ان کمالات اور ارتقائی منازل تک پہنچنے کا پورا امکان پایا جائے۔جس کی صلاحیت انسان کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے۔اس نے کوشش کی ہے کہ اس کی قوت عمل اور ذہانت ان خطرات کا مقابلہ کرنے، ان نقصانات سے بچنے اور ان مفاسد کے دور کرنے میں ضائع نہ ہو جو کبھی غیر منظم زندگی سے پیدا ہوتے ہیں کبھی خود ساختہ قوانین کبھی مطلق العنانی اور جاہ واقتدار کی ہوس سے۔اس کے لئے ایک منزل من اللہ قانون آسمانی شریعت اور خدا کی الوہیت وحاکمیت کے عقیدہ پر ایک نظام خلافت وامارت ضروری ہے۔''

(تاریخ دعوت وعزیمت، حصہ پنجم، ص: ۲۵۹، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ)



تین مسلمات



① اسلام ایک کامل اور ہمہ گیر دین ہے

یہ سمجھنا کہ زندگی کا کوئی شعبہ اس کے دائرے سے باہر ہے یا کسی شعبۂ زندگی میں اس کی تعلیم ناقص ہے۔ نصوص شرعیہ سے انکار کے مترادف ہے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا. (المائدۃ:۳)

ترجمہ: آج میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو بحیثیت دین پسند کر لیا۔

اس کا مطالبہ پورے دین کو اختیار کرنا ہے۔ اونے پونے کی سودا بازی نا قابل قبول اور باعث ہلاکت ہے۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى أَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ. (البقرۃ:۸۵)

ترجمہ: تو کیا تم کتاب کے کچھ حصہ پر ایمان لاتے ہو اور کچھ حصہ کا انکار کرتے ہو پس یہ تم میں سے جو بھی کریں گے ان کا بدلہ دنیا میں صرف رسوائی ہے اور روز قیامت شدید ترین عذاب میں ڈھکیلے جائیں گے اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔

قرآن اور سنت اور ان کی بنیاد پر علمائے اسلام نے فقہ کے نام سے جو ایک جامع قانون مرتب کر دیا ہے۔ اس کا آپ مطالعہ کریں اور دیکھیں انسانی زندگی کا وہ کون سا شعبہ ہے جس کے متعلق اصول قانون اور قانونی نظائر موجود نہیں ہیں۔

علامہ ابن نجیمؒ نے امور دین کو جن مختلف شعبوں میں تقسیم کیا ہے ان سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہر دور میں اسلام کو کامل نظام زندگی سمجھا گیا ہے:

جان لو اُمورِ دین: اعتقادات، عبادات، معاملات، حدود وتعزیرات اور آداب سے متعلق ہیں۔ اعتقادات کی پانچ قسمیں ہیں:

① ایمان باللہ۔ ② ایمان بالملائکہ۔ ③ ایمان بالرسل۔ ④ ایمان بالکتب۔ ⑤ ایمان بالیوم الآخر۔

عبادات بھی پانچ ہیں: ① نماز۔ ② زکوۃ۔ ③ روزہ۔ ④ حج۔ ⑤ جہاد۔

معاملات بھی پانچ ہیں: ① مالی معاوضات۔ ② مناکحات۔ ③ مخاصمات۔ ④ امانات۔ ⑤ ترکہ ومیراث۔

حدود وتعزیرات بھی اصلاً پانچ چیزوں سے متعلق ہیں:

① قتل نفس۔ ② سلب مال۔ ③ ہتک ستر۔ ④ ہتک عزت۔ ⑤ قطع نسل۔

آداب چار ہیں: ① اخلاق۔ ② شمائل حسنہ۔ ③ سیاسیات۔ ④ معاشرتی مسائل۔

(البحر الرائق کتاب الطہارۃ)

صاحب ہدایہ کتاب البیوع میں لکھتے ہیں: "لان البیع انشاء تصرف والانشاء یعرف بالشرع"۔ یعنی بیع ایک تصرف کا پیدا کرنا ہے اور تصرف کا پیدا کرنا شریعت سے معلوم کیا جاتا ہے اس فقرہ میں دراصل ایک اصول بتایا گیا ہے کہ اللہ کی اس زمین پر تصرف کیلئے شریعت کی اجازت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے احکام کی ایسی تقسیم کی ہے جو انسان کی پوری زندگی کو محیط ہے اور کوئی حرکت کوئی فعل کوئی حادثہ اور واقعہ اس سے باہر نہیں ہوسکتا۔

ان کے نزدیک احکام کی دو قسمیں ہیں۔ عزیمت اور رخصت۔ عزیمت اصل ہے اور وقتی عوارض کی بناء پر جو حکم لگایا جاتا ہے اسے رخصت کہتے ہیں۔ عزیمت کے اقسام فرض، واجب، سنت، نفل، حرام، مکروہ اور مباح ہیں۔ آج تک مسائل اور معاملات کی کوئی ایسی قسم نہیں معلوم ہوسکی اور نہ قیامت تک وقوع پذیر ہوسکتی ہے جس کے بارے میں کہا جائے کہ شرعی احکام کے تحت نہیں آتی۔

اوپر ہم نے فقہی تصریحات نقل کی ہیں ان کے ہوتے ہوئے جو لوگ زندگی کے بہت سارے شعبوں کو دین سے خارج بتاتے ہیں اور کہتے ہیں فلاں معاشی مسئلہ ہے۔ یہ حکومت کی باتیں ہیں۔ یہ دنیاوی معاملہ ہے دین کو ان سے کیا بحث۔ ایسے لوگ درحقیقت یا تو مرعوبیت اور ہوس پرستی کے شکار ہیں یا پھر دینی شعور سے نابلد۔

② اللہ تعالیٰ حاکم علی الاطلاق ہے

شریعت اسلامی جب ہر شعبہ زندگی کے لئے اپنا ایک مخصوص حکم اور قانون رکھتی ہے اور ناقص نہیں ہے

تو لازماً وہ ہرگز اس بات کی روادار نہیں ہوسکتی کہ کوئی اس کے حدود سے ذرہ برابر تجاوز کرے اور غیر خدا کی حاکمیت تسلیم کرے خواہ وہ انسان کا اپنا نفس ہو یا کوئی غیر الٰہی حکومت یا کسی ملک کے جمہور اور عوام۔ قانون کی ہمہ گیری سے قانون ساز کی ہمہ گیری از خود ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ اسلام کے نزدیک حاکم اعلیٰ صرف ایک ہے۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ "حکم صرف اللہ کیلئے ہے"۔

فَالْحُکْمُ لِلّٰہِ الْعَلِیِّ الْکَبِیْرِ "حکم اللہ ہی کیلئے ہے جو بالا دست اور بڑا ہے"۔

لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَّةِ الْخَالِقِ "خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں ہے"۔

فقہ میں بھی اس کی صراحت موجود ہے:

والذی یعلم من التوضیح فی ضبطھا ان الحکم مفتقر فی الحاکم والمحکوم علیه والمحکوم به فالحاکم ھواللّٰه تعالیٰ والمحکوم علیه ھو المکلف والمحکوم به فعل المکلف. (نور الانوار، ص:۲۶۶)

ترجمہ: قواعد کے ضبط میں توضیح سے جو چیز معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ حکم محتاج ہے حاکم، محکوم علیہ اور محکوم بہ کا پس حاکم اللہ تعالیٰ ہے اور محکوم علیہ مکلف اور محکوم بہ مکلف کا فعل ہے۔

توضیح میں مزید وضاحت

القسم الثانی من الکتاب فی الحکم ویفتقر الی الحاکم وھو اللّٰه تعالٰی لا العقل علی مامر فی باب الامر. (ص:۶۰۷)

ترجمہ: کتاب میں سے قسم ثانی حکم کے بارے میں ہے اور حکم محتاج ہے حاکم کا اور وہ اللہ تعالیٰ ہے نہ کہ عقل۔ جیسا کہ باب الامر میں گزر چکا۔

لا حکم الا من اللّٰه تعالٰی باجماع الائمة لا کمافی کتب بعض المشائخ ان ھذا عندنا وعندالمعتزلة الحاکم العقل فان ھذا مما لا یجتری علیه احد من یدعی الاسلام. (شرح مسلم الثبوت، ص:۱۳)

ترجمہ: حکم صرف اللہ کا ہے اس پر ائمہ کا اجماع ہے نہ کہ جیسا بعض مشائخ کی کتابوں میں ہے کہ یہ ہمارے نزدیک ہے اور معتزلہ کے نزدیک حاکم عقل ہے کیونکہ یہ ایسی بات ہے جس کی جرأت کوئی مدعی اسلام نہیں کرسکتا۔

معلوم ہوا کہ جس طرح اللہ کے علاوہ کوئی شخص، کوئی خاندان، کوئی گروہ اور کوئی قوم حکم کرنے کی مجاز نہیں ہے

اسی طرح مجرد عقل اور تجربہ کی بنیاد پر بھی کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا اور خدا کی حاکمیت علی الاطلاق کا یہ کہہ کر انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بہت ساری چیزیں عقل وتجربہ سے بھی ثابت ہوتی ہیں اسی لئے فقہ کو اس کی ضرورت پڑی کہ صریح لفظوں میں عقل کی حاکمیت کا انکار کردیا جائے لیکن قابل رنج بات یہ ہے کہ اس وضاحت کی ضرورت پہلے غیر مسلم فلسفیوں کے مقابل میں پڑی تھی اور آج علمبرداران اسلام کے مقابل میں ہے۔

③اصول شریعت

حاکم اعلیٰ اللہ کے تفصیلی احکام اور قوانین معلوم کرنے کے لئے صرف چار ذرائع ہیں۔ کتاب، سنت، اجماع اور قیاس۔ کتاب تو اس لئے کہ وہ صریح طور پر حاکم اعلیٰ کا کلام ہے اور سنت اس لئے کہ رسول یعنی اس کے نمائندہ کی قولی اور عملی تعلیم کا نام سنت ہے اور اجماع اس لئے کہ کتاب وسنت سے ثابت شدہ ہے۔ رہا قیاس اور اس کی دوسری شاخیں استحسان، استصحاب وغیرہ تو ان کی اپنی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے بلکہ کچھ خاص شرائط اور قیود کے ساتھ کتاب وسنت کے مخفی احکام معلوم کرنے کے ذریعے بنتے ہیں بجائے خود ان سے کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا۔

ان چار ذرائع سے جو بھی حکم معلوم ہوگا وہ شریعت کا قانون ہوگا اور ان طریقوں کو چھوڑ کر جو قانون اور ضابطہ بھی بنایا جائے وہ اللہ کی تشریعی حاکمیت سے انکار کی دلیل ہے۔ خواہ وہ قانون اور ضابطہ کوئی ایک فرد بنائے یا کوئی قوم یا کسی ملک کے جمہور۔

دین کی ہمہ گیری کا تقاضا

مذکورہ تینوں مسلمات: ①اسلام کا ہمہ گیر ہونا۔ ②اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور ③شریعت کے اصول اربعہ، کو تسلیم کرنے کا تقاضا ہے کہ انسان کا سراپا دین میں گم ہوجائے اور تمام مسائل زندگی کی اساس دین قرار پائے۔ انسان مدنی الطبع ہے اس کو ہر دور میں اجتماعی نظم کی ضرورت رہی ہے جو سب کو کنٹرول کرسکے۔ انتشار اور انارکی اجتماعیت کی ضد ہے اس انتشار اور انارکی کو دور کرنے اور اجتماعی نظم قائم کرنے ہی کا نام نظام خلافت اور ہماری زبان میں حکومت ہے۔ سوال یہ ہے کہ حکومت کیوں دین کی بنیاد پر نہ ہو؟ کس دلیل کی بناء پر انسانی زندگی کے اس اہم شعبہ کو خدائی حاکمیت سے آزاد کیا جائے؟ کیا حکومتی عمل خدا کی بنائی ہوئی دنیا کے علاوہ کسی دوسری دنیا میں ہوتا ہے؟ یہ زمین اس کی، آسمان اس کا، ساری مخلوق اس کی تو پھر کس بنیاد پر اس کے حکم کے بغیر تصرف کرنا روا ہوسکتا ہے؟ کیا اس کی کوئی سند پیش کی جاسکتی ہے؟ کہ اس نے اپنے اقتدار اور اختیار کو محدود کردیا ہے خدا کے پیغمبروں نے اس کی حاکمیت کے لئے کوئی لائن کھینچ دی ہے کہ یہ خدائی حکومت کی سرحد ہے اور یہ قیصر کی۔

عقل کا تقاضا شرعی مسلمات، اسوۂ انبیاء اور خلفائے راشدین کی اتباع کا مطالبہ ہے کہ حکومتی عمل بھی اسلام کے زیر سایہ ہو اور خدائی ہدایت کے تحت ہو نہ کہ اس سے آزاد۔ ایک اور پہلو سے بھی غور کیجئے۔ شریعت کے کچھ احکام ہر ہر فرد سے متعلق ہیں اور ایک معتد بہ تعداد ایسے احکام کی ہے جن کی مخاطب پوری امت ہے۔ مثلاً قرآن میں صریح طور پر چور کے بارے میں حکم ہے۔

اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا. (المائدۃ:۳۸)

چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹو۔

یہ ایک کھلا ہوا حکم ہے۔ جس کا مخاطب کسی فرد یا طبقہ کو نہیں بتایا گیا بلکہ تمام مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے لیکن اس حکم کی تعمیل ہر ہر شخص الگ الگ نہیں کرسکتا اور نہ بیک وقت پوری امت کے ہاتھوں اس کی تعمیل ہوسکتی ہے۔ پھر تعمیل کیسے ہو اس کا صرف ایک جواب ہے وہ یہ کہ پوری امت جسد واحد بن جائے اس کا ایک قائد اور سربراہ ہو اس کا اپنا ایک اجتماعی نظم ہو جس کے ذریعہ اجتماعی احکام کی تنفیذ عمل میں آئے۔ امت میں انتشار اور انارکی ہو تو شریعت کے بہت سارے احکام کی تعمیل نہیں ہوسکتی۔ اسی بناء پر اسلام میں اجتماعیت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا. (آل عمران:۱۰۳)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑو اور آپس میں تفرقہ میں نہ پڑو۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

يَدُ اللّٰهِ مَعَ الْجَمَاعَة و مَن شَذَّ شُذَّ الی النّار. (الترمذی)

ترجمہ: ''اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے جو جماعت سے الگ ہو وہ آگ میں گیا۔''

عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ فَاِنَّمَا يَاكُلُ الذِّئبُ مِنَ الْغَنَمِ القَاصِية. (ابوداؤد)

ترجمہ: تم پر جماعت لازم ہے اس لئے کہ بھیڑیا انہی بکریوں کو کھاتا ہے جو گلہ سے بچھڑ جاتی ہیں۔

عہد رسالت میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات خود اللہ کی جانب سے پوری امت کی راہبر اور ذمہ دار تھی اور وہ سب احکام جو اجتماعیت سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھوں انجام پاتے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد صحابہ کرامؓ نے ایک خلیفہ کے انتخاب کے ذریعہ اس ذمہ داری کو کما حقہ ادا کیا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت انتشار کا شکار نہیں ہوئی۔

اجتماعیت کے اسی نظام کو اسلام کی اصطلاح میں خلافت وامارت سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی خلافت کو ہم

اسلامی حکومت یا حکومت الٰہیہ کہتے ہیں یہ حکومت مختلف ناموں سے ہر دور میں مسلمانوں کا مطمحِ نظر اور ان کے نزدیک حکومت کا سب سے اعلیٰ معیار رہی ہے اور ان کو یہ یقین رہا ہے کہ اس کا قیام ایک فریضہ ہونے کے ساتھ ساتھ دنیا سے شر وفساد مٹا کر امن قائم کرنے کی واحد تدبیر ہے۔

اسلامی خلافت

اوپر کی گفتگو سے اسلامی حکومت اور خلافت کی تعریف خود متعین ہوجاتی ہے لیکن مزید توضیح کے لئے میں یہاں ابن خلدونؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تعریفیں نقل کرتا ہوں۔ ابن خلدون نے خلافت کی جو تعریف کی ہے اس کا مفہوم یہ ہے:

''خلافت کے لغوی معنی جانشینی اور اس کا اصطلاحی مفہوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین کی حیثیت سے مطلق دینی اور دنیاوی امور میں فرمانروائی کا حق تھا خلیفہ کی شخصیت شرعی نقطہ نظر سے دینی و دنیاوی معاملات میں فرمانروائی کی حامل تھی۔ یہ فرمانروائی شریعت کے دستور اور قوانین کی پابند تھی خلافت کا حقیقی مقصد ناموس اسلام کا تحفظ اور شرعی زاویہ نگاہ سے حکومت کے نظم ونسق کی تنظیم اور اس کا قیام تھا۔''

شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے خلافت کی تعریف یوں کی ہے:

هی الرياسة العامة فی التصدی لاقامة الدين باحياء العلوم الدينية، و اقامة اركان الاسلام، والقيام بالجهاد وما يتعلق به من ترتيب الجيوش والفروض للمقاتلة، واعطاء هم من الفيیء والقيام بالقضاء واقامة الحدود، ورفع المظالم، والامر بالمعروف والنهی عن المنكر نيابة عن النبی صلى الله عليه وآله وسلم.

(ازالة الخفا، مقدمة، ص:١٦٦)

''نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیابت میں علوم دینیہ کے زندہ کرنے اور ارکان اسلام کو قائم کرنے اور جہاد اور متعلقات جہاد جیسے لشکروں کو ترتیب دینے مجاہدین کو وظائف دینے مال غنیمت کو تقسیم کرنے اور عہدۂ قضاء کے فرائض انجام دینے اور حدود کو قائم کرنے اور مظالم کو رفع کرنے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ اقامت دین کا اہتمام کرنے والی ریاست عامہ کو خلافت کہتے ہیں۔''

یہ دو اقتباس اسلامی حکومت کی تعریف متعین کرنے کے لئے بالکل کافی ہیں۔ اسلامی حکومت کے مقاصد اور دائرہ کار کو غیر مبہم الفاظ میں یہاں واضح کردیا گیا ہے۔ اب جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام میں حکومت کا کوئی خاص تصور اور خاکہ نہیں ہے۔ تو ان سے پوچھا جائے کہ اگر یہ خاص تصور نہیں تو کیا ہے؟ کسی ہیئت کا متعین نہ ہونا اور بات ہے اور مقاصد، دائرہ کار، آئیڈیالوجی کا متعین نہ ہونا دوسری بات ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی حکومت علمی اور نظری، عملی اور واقعاتی ہر لحاظ سے ایک جانی پہچانی چیز ہے۔ تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ خلفائے راشدین نے جس نوعیت کی حکومت بنائی وہ حکومت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے اور اس کا نام اسلامی حکومت ہے۔ لیکن حقائق کو جھٹلانے پر اگر کوئی تل جائے تو اس کا علاج ہی کیا ہے؟

اقامت خلافت کی دینی حیثیت

اسلامی حکومت کی تعریف متعین ہو جانے کے فوراً بعد یہ سوال آتا ہے کہ اس کو برپا کرنے کی دینی حیثیت کیا ہے؟ فرض ہے، نفل ہے، مباح ہے۔ آخر کیا ہے؟

شریعتِ اسلامی کا یہ ایک کلیہ اور طے شدہ اصول ہے کہ فرائض اور واجبات کی ادائیگی جن چیزوں پر موقوف ہوتی ہے وہ بھی فرض اور واجب ہو جاتی ہیں۔ مثلاً وضو کی فرضیت کے ساتھ ساتھ پانی کے حصول کی کوشش بھی بقدر استطاعت فرض ہے اگر کوئی شخص وضو نہ کرنے کی وجہ بتائے کہ میں مسجد میں گیا لیکن وہاں پانی موجود نہ تھا تو اس کا یہ عذر کسی بھی طرح وضو کی فرضیت کو ساقط نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس پر کنویں سے پانی نکالنا یا کسی سے طلب کرنا ویسے ہی فرض ہے جیسے وضو فرض ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ پانی کے حصول کے لئے جو ذرائع اور وسائل اکٹھا کرنے ضروری ہیں ان سب کا مہیا کرنا بھی حسب استطاعت فرض ہے۔ اسی بناء پر کسی مسافر کے لئے بھی طلب اور جستجو سے پہلے جائز نہیں کہ وضو کے بجائے تیمم کر لے۔ بشرطیکہ آس پاس پانی ملنے کی توقع ہو یا اس کے کسی ساتھی کے پاس موجود ہو۔

> الاترىٰ ان تحصيل اسباب الواجب واجب وتحصيل اسباب الحرام حرام بالاجماع. (مسلم الثبوت، ص:۳۸)
>
> ترجمہ: کیا تم نہیں جانتے کہ واجب کے ذرائع کا حاصل کرنا واجب اور حرام کے ذرائع کا حاصل کرنا حرام ہے بالاجماع۔

''جس واجب کے اسباب اور شروط کی تحصیل واجب ہوتی ہے اس میں علمائے اصول فقہ نے دو قیدیں لگائی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ واجب مطلق ہو، شارع کی طرف سے کسی سبب یا شرط کے ساتھ مقید نہ ہو۔ دوسری یہ کہ وہ سبب شرط مکلف کے مقدور میں ہو ان دو قیدوں میں سے کوئی ایک قید بھی اگر غائب ہو جائے تو پھر سبب و شرط کی تحصیل واجب نہ ہوگی۔ پہلی قید کی شرعی مثال وجوب زکوٰۃ کا مسئلہ ہے۔ چاندی سونے میں وجوب زکوٰۃ کا سبب ایک مکمل نصاب کی ملکیت ہے اور شرط ''حولان حول'' ہے لیکن کسی مسلمان پر نہ اس سبب کی تحصیل واجب ہے اور نہ اس شرط کی۔ یعنی کسی مسلمان پر نہ تو یہ واجب ہے کہ وہ جدوجہد کر کے صاحب نصاب بنے اور

نہ کسی صاحب نصاب پر یہ واجب ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے وہ سال بھر تک بہر حال نصاب کو محفوظ رکھے اس کی وجہ یہ ہے کہ وجوب زکوٰۃ کا حکم مطلق نہیں ہے بلکہ شریعت کی طرف سے ایک مقید حکم ہے۔

شریعت کا مطالبہ یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان صاحب نصاب ہو اور سال بھر تک اس کے پاس نصاب محفوظ رہے تو اس پر اس نصاب کی زکوٰۃ واجب ہے۔ اس طرح کے مقید حکم وطلب میں کسی شخص پر شریعت کی طرف سے سبب وشرط کی تحصیل کا فریضہ عائد نہیں ہوتا بلکہ جب سبب اور شرط پائے جائیں تو اس حکم پر عمل واجب ہوتا ہے۔ دوسری قید کی مثال نماز کے اوقات ہیں جن کو اسباب کی حیثیت حاصل ہے لیکن ان اسباب کی تحصیل کسی پر واجب نہیں۔ اس لئے کہ وہ انسان کے بس سے باہر ہیں۔ ایسا واجب جو شریعت کی طرف سے کسی سبب یا شرط کے ساتھ مقید نہ ہو بلکہ مطلق ہو۔ لیکن اس کا وجود یا صحت ادا کسی سبب یا کسی شرط پر موقوف ہو تو ایسے سبب یا شرط کی تحصیل واجب ہے۔ مثلاً شارع کسی مسلمان کو مکلف کرے کہ اپنا غلام آزاد کر تو اس واجب کا وجود یعنی اس غلام کی آزادی ایک سبب پر موقوف ہے اور وہ ہے لفظ ''اعتقت'' کا نطق، یعنی جب تک کوئی شخص یہ نہ کہے کہ ''میں نے اس غلام کو آزاد کیا'' اس وقت تک غلام آزاد نہیں ہوسکتا، لہٰذا اس سبب کی تحصیل اس پر واجب ہوگی یا شارع نے کسی کو مکلف گردانا کہ ''علم حاصل کر'' ظاہر ہے کہ اس واجب کا حصول چند اسباب پر موقوف ہے تو ان اسباب کی تحصیل اس پر واجب ہوگی اس لئے کہ ان اسباب کی تحصیل کے بغیر عام حالات میں علم حاصل نہیں ہوتا۔

صحت ادا کی مثال نماز میں وضو کی شرط ہے۔ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ وضو وجوب صلوٰۃ کی شرط نہیں ہے بلکہ صحت ادا کی ہے۔ یعنی بات یہ نہیں کہ جب تمہیں وضو ہو تو تم پر نماز واجب ہے بلکہ یہ ہے کہ نماز جو تم پر واجب ہے وہ وضو کے بغیر ادا نہیں ہوتی لہٰذا جس شخص پر نماز واجب ہو اس پر اس شرط کی تحصیل واجب ہے وجوب زکوٰۃ کی شرط اور صحت ادائے صلوٰۃ کی شرط میں بنیادی فرق ہے۔ جس کو سمجھ لینا چاہئے۔ اسباب وشروط کی تحصیل کے وجوب وعدم وجوب کی تفصیل نہ جاننے کی وجہ سے بعض ذہین لوگوں کو بھی دھوکا ہو جاتا ہے۔ اب ان تفصیلات کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ مثال کے طور پر چور کا ہاتھ کاٹ دینے اور زانی کو کوڑے مارنے کی جو مطلق تکلیف مسلمانوں کو دی گئی ہے اس کا وجوب یا صحت ادا حکومت کی شرط پر موقوف ہے یا نہیں؟ اگر ہے اور یقیناً ہے تو اس شرط کی تحصیل بھی یقیناً واجب ہوگی۔ بالفرض کوئی شخص دعویٰ کرتا ہے کہ قطع ید وغیرہ کا وجوب مطلق نہیں ہے بلکہ مقید ہے تو اسے اس کا ثبوت دینا چاہئے۔

علمائے حق اس پر متفق ہیں کہ نصب امام یا اسلامی حکومت کا قیام ان احکام کی ادائیگی کے موقوف علیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی ان احکام کے وجوب میں بھی یہ بات نہیں ہے کہ اگر خلیفہ موجود ہو اور حکومت قائم ہو تو ان

پر عمل کرو بلکہ بات یہ ہے کہ یہ احکام جو تم پر واجب ہیں وہ نصب خلیفہ اور حکومت کے بغیر ادا نہیں ہو سکتے لہٰذا ان احکام پر عمل کرنے کے لئے تم پر اس شرط کی تحصیل واجب ہے۔(ماخوذ)

اس اصول کو جان لینے کے بعد آپ قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی میں مندرج احکام پر ایک نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کتنے فرائض اور واجبات کی ادائیگی کا دارومدار اسلامی حکومت کا قیام قرار پاتا ہے بطور مثال چند احکام ملاحظہ ہوں۔

جہاد، قطع ید، حدِ قذف، حد زنا، حد خمر اور معاملات میں اللہ کی نازل کردہ ہدایات کے مطابق فیصلہ کرنا یہ قرآن کے قطعی احکام ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ان پر آج عمل نہیں ہو رہا ہے۔ ہر مسلمان قرآن میں پڑھتا ہے۔ مدرسوں میں ان پر بحثیں ہوتی ہیں تکرار ہوتی ہے مقررین اور مصنّفین ان کی باریکیاں بیان کرتے ہیں، ان کے فوائد اور ان کے اندر پوشیدہ حکمتوں پر سننے والے سر دھنتے ہیں مگر جب عمل کا سوال آتا ہے تو جواب نفی میں آتا ہے اور بڑی آسانی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ اس کے لئے حکومت ضروری ہے اور آج حکومت اسلامی نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ جب یہ احکام اسلامی حکومت پر موقوف ہیں تو پھر شرط موقوف علیہ کی تحصیل ہم پر واجب ہے۔ اوپر کی مثالوں میں سے ایک کی ذرا تفصیل ہم پیش کرتے ہیں تاکہ ہمارا مقصود اچھی طرح واضح ہو سکے۔ ہدایہ کے محشی لکھتے ہیں۔

واما وصف القضاء ففرض كفاية فلو امتَنَعَ الكل اثموا وقد امر اللّٰه تعالىٰ نبيه ﷺ بقول "وان احكم بينهم بما انزل اللّٰه اليک" وبعث النبی ﷺ عليا قاضيًا الى اليمن ومعاذا وعليه اجماع المسلمين۔

ترجمہ: رہا قضاء کا حکم تو وہ فرض کفایہ ہے اگر سب لوگ رک جائیں تو سب گنہگار ہوں گے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ لوگوں کے درمیان اللہ کی نازل کی ہوئی ہدایت کے مطابق فیصلہ کرو اور نبی ﷺ نے حضرت علیؓ اور حضرت معاذؓ کو یمن کی طرف قاضی بنا کر بھیجا اور اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔

کتاب المبسوط میں کتاب القاضی کی ابتداء ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

اعلم بان القضاء بالحق من اقوى الفرائض بعد الايمان بالله تعالىٰ وهو من اشرف العبادات لاجله اثبت اللّٰه تعالىٰ لادم عليه السلام اسم الخلافة فقال جل جلاله انی جاعل فی الارض خليفة واثبت ذالک لداؤد عليه السلام فقال عزوجل "يا داؤد انا جعلنک خليفة فی الارض" وبه امر کل نبی مرسل حتّٰی

خاتم الانبیاء علیھم الصلوٰۃ والسلام۔ قال اللّٰہ تعالٰی "اِنَّآ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىةَ فِيۡهَا هُدًى وَّنُوۡرٌ‌ ۚ يَحۡكُمُ بِهَا النَّبِيُّوۡنَ" وقال تعالٰی "وَاَنِ احۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ اِلَيۡكَ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ". (۵۹)

ترجمہ: جان لو حق کے ساتھ فیصلہ کرنا ایمان باللہ کے بعد قوی ترین فرائض اور افضل ترین عبادات میں سے ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالٰی نے حضرت آدم علیہ السلام کے لئے خلیفہ کا نام تجویز فرمایا اور ارشاد ہوا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں اسی چیز کو داؤد علیہ السلام کے لئے قائم رکھا اور فرمایا اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا اور اسی بات کا ہر نبی حتی کہ خاتم الانبیاء کو بھی حکم دیا اور ارشاد ہوا ہم نے تورات اتاری اس میں ہدایت اور نور ہے جس کے مطابق انبیاء فیصلہ کرتے ہیں نیز ارشاد ہے اللہ کی نازل کردہ ہدایت کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔

اس کے بعد صاحب مبسوط نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے نام حضرت عمرؓ کے ایک خط سے یہ فقرہ نقل کیا ہے: اما بعد فان القضاء فریضۃ محکمۃ و سنۃ متبعۃ یعنی قضاء ایک محکم فریضہ ہے اور قابل اتباع سنت ہے اور سنت کی تشریح اس طرح کی ہے۔ (سنۃ متبعۃ ای طریقۃ مسلوکۃ فی الدین یجب اتباعھا علی کل حال) یعنی سنت دین میں ایک ایسا لائق پیروی طریق ہے جس کی اتباع ہر حال میں واجب ہے۔ یہ ہے وہ فریضہ جو تمام انبیاء علیہم السلام پر عائد کیا گیا اور آخر میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا حکم دیا گیا اور بڑی شدومد کے ساتھ۔ جس کا اندازہ ان آیات سے ہوتا ہے:

مَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۤٮِٕكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ. (المائدۃ:۴۴)

ترجمہ: جس نے اللہ کی ہدایت کے مطابق فیصلہ نہیں کیا وہ کافر ہے۔

مَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۤٮِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ. (المائدۃ:۴۵)

ترجمہ: جس نے اللہ کی ہدایت کے مطابق فیصلہ نہیں کیا وہ ظالم ہے۔

مَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۤٮِٕكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ. (المائدۃ:۴۷)

ترجمہ: جس نے اللہ کی ہدایت کے مطابق فیصلہ نہیں کیا وہ فاسق ہے۔

مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ فرمائیے اور بتائیے اس فریضہ کی ادائیگی کی کیا صورت ہوسکتی ہے ہاں یہ واضح رہے کہ غیر اسلامی حکومتوں میں جو جج اور عدالتیں ہوتی ہیں ان کے ذریعہ یہ فرض ہرگز ادا نہیں ہوسکتا ہے کیونکہ قاضی کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ بما انزل اللہ کے مطابق فیصلہ کرے اور دوسری شرط یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو۔ یہاں

یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ صرف نکاح، طلاق اور میراث کے ہی معاملات میں شرعی قاضی کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ بلا استثنیٰ سارے معاملات زندگی میں اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ لینے کے علاوہ ایک مومن کے لئے کوئی دوسری راہ نہیں ہے اب سوال یہ ہے کہ ان شرائط و قیود کے ساتھ مقید عدالتیں دنیا کی کس حکومت نے مسلمانوں کو مہیا کر کے دی ہیں یا دے سکتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس فرض کفایہ کی ادائیگی اور دیگر بے شمار فرائض سے سبکدوشی اسلامی حکومت کے بغیر ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بااختیار امام اور خلیفہ کا مقرر کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ عقائد کی مشہور کتاب شرح عقائد نسفی میں صاحب کتاب لکھتے ہیں:

ثم الاجماع على ان نصب الامام واجب والمذهب انه يجب على الخلق سمعا لقوله ﷺ من مات ولم يعرف امام زمانه فقد مات ميتة جاهلية ولان الامة قد جعلوا اهم المهمات بعد وفاة النبى صلى الله عليه وسلم نصب الامام حتى قدموه على الدفن وكذا بعد موت كل امام ولان كثيرا من الواجبات الشرعية يتوقف عليه كما اشار اليه بقوله والمسلمون لا بدلهم من امام يقوم بتنفيذ احكامهم واقامة حدودهم وسد ثغورهم وتجهيز جيوشهم واخذ صدقاتهم وقهر المتغلبة والمتلصصة وقطاع الطريق واقامة الجمع والاعياد وقطع المنازعات الواقعة بين العباد وقبول الشهادات القائمة على الحقوق و تزويج الصغار والصغائر الذين لا أولياء لهم وقسمة الغنائم۔ (۱۰۹)

ترجمہ: ''پھر اس بات پر اجماع ہے کہ امام کا مقرر کرنا واجب ہے اور اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ مخلوق پر واجب ہے نبی ﷺ کے اس قول کی بناء پر کہ جو مر گیا اور اپنے زمانے کے امیر کو نہیں پہچانا وہ جاہلیت کی موت مرا اور اس لئے کہ نبی ﷺ کی وفات کے بعد امت نے سب سے اہم کام امام کے تعین کو قرار دیا یہاں تک کہ دفن پر مقدم رکھا اور ایسا ہی ہر امام کی وفات کے بعد ہوا اور اس لئے بھی کہ بہت سے شرعی واجبات اس پر موقوف ہیں جیسا کہ انھوں نے اشارہ کیا کہ مسلمانوں کے لئے ایک ایسا امام ضروری ہے جو ان کے احکام کو جاری اور ان کے حدود کی اقامت اور ان کے سرحدوں کی حفاظت اور ان کے لشکروں کی تیاری اور ان کے صدقات کو لینے اور باغیوں، چوروں، ڈاکوؤں کو مغلوب اور جمعہ وعیدین کی اقامت اور لوگوں کے درمیان پیدا شدہ قضیوں کا فیصلہ اور حقوق پر ثابت ہونے والی شہادتوں کو قبول اور لاوارث بچوں اور بچیوں کی شادی اور مال غنیمت کی تقسیم کرنے کی ذمہ داری اٹھائے۔''

علامہ ابن حزمؒ لکھتے ہیں:

اتفق جميع اهل السنة وجميع المرجية وجميع الشيعة وجميع الخوارج على وجوب الامامة وان الامة واجب عليها الانقياد لامام عادل يقيم فيهم احكام الله ويسوسهم باحكام الشريعة التى اتى بها رسول الله ﷺ حاشا النجدات من الخوارج. (الملل والنحل:۴/۷۳)

ترجمہ: ''تمام اہل سنت، مرجیہ، شیعہ باستثناء نجدات تمام خوارج امامت کے وجوب پر متفق ہیں۔ اور اس بات پر بھی کہ امت پر ایک ایسے امام عادل کی اطاعت واجب ہے جو اللہ کے احکام قائم کرے اور لوگوں کا نظم اس شریعت کے احکام کے مطابق چلائے جو اللہ کے رسول (ﷺ) لائے ہیں۔''

شاہ ولی اللہ صاحب ازالۃ الخفاء میں لکھتے ہیں:

''واجب بالکفایہ امت بر مسلمین الیٰ یوم القیامۃ نصب الخلیفہ متجمع شروط بچند وجہ یکے آنکہ صحابہ رضوان اللہ علیہم بہ نصب خلیفہ وتعین وپیش از دفن آں حضرت ﷺ متوجہ شدند پس اگر از شرع وجوب نصب خلیفہ ادراک نمی کردند بریں امر خطیر مقدم نمی ساختند وایں وجہ اثبات دلیل شرعی از آن حضرت ﷺ نماید بروجہ اجمال''۔

ترجمہ: ایسے خلیفہ کو مقرر کرنا جو جامع شرائط ہو روز قیامت تک مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے چند وجوہ کی بناء پر۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے خلیفہ کے نصب اور تعین کو نبی ﷺ کی تدفین پر مقدم رکھا۔ اگر انہوں نے خلیفہ کے تعین کے وجوب کو شریعت سے ادراک نہ کیا ہوتا تو اس اہم کام پر اسے مقدم نہ کرتے یہ صورت اجمالی طور پر آنحضرت ﷺ کی طرف سے دلیل شرعی کا اثبات کرتی ہے۔

ان معتبر حاملین شریعت نے امام اور خلیفہ کے تعین کو فرض کفایہ بتایا اور دعویٰ کر رہے ہیں کہ اس بارے میں امت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ فریضہ کسی خاص وقت کے ساتھ مخصوص یا کسی خاص مقام کے ساتھ مقید نہیں ہے اس لئے مخصوص حالات یا مخصوص ممالک ومقامات اور موہوم خطرات کی بناء پر اس فرض کفایہ کی فرضیت اور اس کے ایک مسلم حقیقت ہونے سے انکار کرنا ایک جرم سے کم نہیں۔ ایک مومن کے لئے صحیح روش یہی ہو سکتی ہے کہ اپنی وسعت کے مطابق اس کے لئے کوشش کرے اور اگر کوئی اپنے اندر ہمت اور سکت نہیں پاتا تو کم از کم جو بات ہو سکتی ہے وہ یہ کہ کوشش کرنے والوں کے لئے اللہ سے دعا کرے۔ رہے وہ لوگ جو اقتدار وقت کی خوشامد اور ذاتی فائدوں کے لئے اسلامی حکومت کا نام لینے والوں کے سروں پر کلہاڑی مارنے پر آمادہ ہیں انہیں خدا سے

ڈرنا چاہئے۔ یہ عجیب بات ہے کہ کچھ لوگ اسلام کا دعویٰ کرتے ہوئے لادینی حکومتوں کے قیام کی تائید کرسکتے ہیں لیکن خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم کرنے کے لئے تحریک اقامت دین کی تائید نہیں کرسکتے بلکہ اس کے مقابلہ کے لئے محاذ بنا سکتے ہیں اور کوشش کرنے والوں کو غیرمسلموں کے سامنے مطعون کرسکتے ہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ع ببیں تفاوت رہ از کجاست تابکجا

کہا جاتا ہے کہ اسلام میں حکومت مقصود نہیں ہے۔ اس لئے اسلامی حکومت کو نصب العین نہیں بنایا جاسکتا لیکن ہم نہیں سمجھ سکے کہ کسی چیز کو قابل رد اور قابل اجتناب قرار دینے کے لئے مقصود اور نامقصود کی بحث کیوں چھیڑی گئی۔ کسی چیز پر حکم لگانے کے لئے فقہ میں جو اصطلاحیں ہیں انہیں کیوں نہیں استعمال کیا گیا نامقصود کے بجائے حرام، مکروہ، ناجائز کہنا زیادہ مناسب تھا یہ سیدھا طریقہ چھوڑنے کی وجہ یا تو لفظ غیرمقصود کی فقہی اصطلاح سے ناواقفیت ہے یا لوگوں کو فریب دینے کی کوشش، فقہ کی اصطلاح میں کسی شئے کے غیرمقصود ہونے کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ وہ چیز غیراہم اور لائق اجتناب ہے۔ فقہاء نے عبادات کی دو قسمیں کی ہیں مقصودہ اور غیرمقصودہ۔ مثلاً نماز عبادت مقصود ہے اور وضو، ستر عورت، استقبال قبلہ، اذان غیرمقصودہ ہیں لیکن اس کے باوجود وضو فرض ہے۔ ستر عورت، استقبال قبلہ نماز کے لئے شرط ہیں اور اذان کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ اگر کوئی بستی بالکلیہ اذان کو ترک کردے تو اس سے قتال کیا جائے گا۔ اب ایک شخص کہے کہ یہ ساری چیزیں دین میں مقصود نہیں ہیں اس لئے نعوذ باللہ غیراہم اور ناقابل اہتمام ہیں تو اس شخص پر آپ کیا حکم لگائیں گے۔

فقہاء نے امورِ دین کو پانچ اقسام پر تقسیم کیا ہے، اعتقادات، عبادات، معاملات، آداب، حدود اور تعزیرات۔ اس تقسیم کی بناء پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اصطلاح فقہ کی رو سے دین کا کم از کم ۳/۵ حصہ مقصود نہیں ہے۔ مثلاً قتال فی سبیل اللہ افضل ترین عبادت ہے لیکن اس کے باوجود خود مقصد نہیں ہے بلکہ ایک مقصد کا وسیلہ ہے۔ اسی طرح شریعت کے حدود ہاتھ کاٹنا، کوڑے لگانا، سنگسار کرنا بھی اصلاً خود مقصود نہیں ہیں، لیکن ان کی اہمیت ووجوب کا حال یہ ہے کہ ان کا انکار یا ترک تو دور کی بات ہے ان سے غفلت یا مجرمین کی پاسداری اور رعایت بھی جرم عظیم ہے۔

لَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ.
(النور:۲)

ترجمہ: ان دونوں زانی مرد اور عورت پر تم کو اللہ کے دین میں رحم نہ آئے اگر تمہیں اللہ اور قیامت پر ایمان ہے۔

چنانچہ اس طرح کے سارے احکام فقہاء کی زبان میں **مقصود الفعل** اور **مطلوب التحصیل لغیرہ** ہیں یعنی جن کا کرنا مقصود ہے جن کی تحصیل کسی غیر شئے کے لئے مطلوب ہے۔

بعض عبادتیں خود مقصود بالذات ہوتی ہیں مثلاً نماز، روزہ۔ اور بعض عبادتیں کسی دوسری عبادت کا ذریعہ اور شرط بنتی اور وسیلہ کا کام دیتی ہیں مثلاً وضو نماز کے لئے شرط ہے۔ محض اسی فرق کو ظاہر کرنے کے لئے مقصود اور غیر مقصود کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ غیر مقصود احکام غیر اہم ہیں بلکہ تعمیل و ادائیگی کے لحاظ سے عبادات مقصودہ پر مقدم ہیں۔

یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ حکومت الٰہیہ کو غیر مقصود کہنے کی غرض یہ ہے کہ شریعت میں مومن کا مقصد وجود صرف رضائے الٰہی ہے۔ حکومت اصل مقصود نہیں۔ ہم کو تسلیم ہے اور کسی مومن کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ مومن کا مقصد وجود رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ لیکن اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ ہم اقامت دین اور قیام خلافت کی جدوجہد کے مکلف نہیں ہیں۔ عبادات مقصودہ کا اصل مقصد بھی رضائے الٰہی کا حصول ہی ہے تو کیا نعوذ باللہ ہم ان کے مکلف نہیں ہیں اور آزاد ہیں کہ جس طرح جی چاہے رضائے الٰہی حاصل کریں۔ اسلامی حکومت کی اصل غرض تو یہی ہے کہ تمام عبادات اور تمام احکام ٹھیک اس طرح ادا کئے جائیں جس طرح اللہ و رسول نے ہمیں سکھائے ہیں۔

اس مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے مومن کا مقصد اصلی رضائے الٰہی ہے لَا رَيْبَ فِيْهِ مگر جو اس کے ذرائع و شرائط ہیں انہیں اگر نا مقصود کہہ کر الگ کر دیا جائے تو شریعت کے ایک بہت بڑے اصول کا بطلان لازم آتا ہے وہ یہ کہ عقائد میں یہ بات شامل ہے کہ تکلیف مالا یطاق جائز نہیں لیکن اس طریقہ استدلال سے یہ اصول ٹوٹ جاتا ہے۔ رضائے الٰہی کے حصول کیلئے اجتماعی احکام پر عمل کرنا یا عمل کرنے کی سعی کرنا بھی ضروری ہے۔

مثال کے طور پر شریعت کے حدود و تعزیرات کی تنفیذ اور کتاب و سنت کے مطابق مقدمات مخاصمات کے فیصلے بھی ضروری ہیں اور ان کی شرط و وسیلہ حکومت اسلامی کا قیام ہے۔ اب اگر کہا جائے کہ حکومت اسلامی کی بات مت کرو کیونکہ یہ مقصود نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ رضائے الٰہی کی تحصیل کا مکلف بنانا تکلیف مالا یطاق کے سواء کچھ بھی نہیں ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ شریعت میں انسان کو کسی چیز کا مکلف بنانے کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اس کے حصول کے لئے جو اسباب و ذرائع اور شروط ضروری ہیں ان کے حاصل کرنے کی وہ کوشش کرے اگر وہ کوشش کرتا ہے اور بالفرض منزل تک پہنچنے سے قبل ہی دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو وہ کامیاب ہے گویا کوشش ہی اس کی منزل تھی لیکن اگر وہ کوشش بھی نہیں کرتا اور مر جاتا ہے تو پھر رضائے الٰہی کا انمول موتی کس طرح اسے مل سکتا ہے۔

اب ایک دوسرے پہلو سے غور کیجئے اب تک جو گفتگو ہوئی وہ بندہ کے لحاظ سے تھی کہ بندہ کا مقصود حیات کیا ہے؟ سوال یہ ہے کہ شریعت وضع کرنے اور انبیاء ورسل کا سلسلہ قائم کرنے سے خداوند عالم کا کیا مقصد ہے وہ تو بے نیاز ہے اس کو کسی چیز کی احتیاج نہیں۔ وہ نہ بندوں سے کچھ چاہتا ہے اور نہ بندے اسے کچھ دے سکتے ہیں۔ اس لئے خالق کائنات کا مقصود صرف یہی ہوسکتا ہے کہ بندے بلا کسی تفریق واستثناء اس کے ہر حکم کی تعمیل کریں اور دنیا وآخرت میں اس کی رحمتوں کے مستحق بنیں۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ مَآ أُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ أُرِيْدُ أَنْ يُّطْعِمُوْنِ. (الذاریات:۵۷،۵۶)

ترجمہ: میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔

اس سلسلہ میں علامہ شاطبیؒ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ......

''شریعت وضع کرنے سے شارع کا مقصد یہ ہے کہ بندے کا قصد شارع کے قصد کے موافق ہو اور اس کا عمل شارع کی منشاء کے خلاف نہ ہو اس لئے کہ شریعت بندوں کے مصالح کے مطابق اتاری گئی ہے اور اس لئے بھی کہ انسان اللہ کی عبادت کے واسطے پیدا کیا گیا ہے اور عبادات کا حاصل یہ ہے کہ شارع کی منشاء پوری کر کے دنیا وآخرت دونوں جہاں میں رحمت خداوندی کا استحقاق پیدا کیا جائے اور اس لئے بھی کہ شارع کا مقصد شریعت سے ضروریات، یعنی دین، عقل، نسل، نفس، مال کی حفاظت کرنی ہے اور شریعت کے ان مصالح کو بروئے کار لانے میں انسان اللہ کا خلیفہ ہے اور خلافت کی کم از کم حد یہ ہے کہ وہ اپنے اوپر قائم کرے اور پھر دوسروں پر۔

اسی بناء پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته.'' (بخاری)

ترجمہ: تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے متعلق پوچھا جائے گا۔

قرآن میں آیا ہے:

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ. (الحدید:۷)

ترجمہ: اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس میں سے خرچ کرو جس میں اللہ نے تم کو خلیفہ بنایا ہے۔

اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً. (البقرۃ:۳۰)

ترجمہ: میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ. (الاعراف:۱۲۹)

ترجمہ: اور وہ زمین میں تم کو خلیفہ بنائے گا تاکہ دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ. (الانعام:۱۶۵)

ترجمہ: اس نے زمین میں تم لوگوں کو خلیفہ بنایا اور تمہارے بعض کو بعض پر فوقیت دی تاکہ تمہیں آزمائے دی ہوئی چیزوں میں۔

یہ خلافت عام ہے کہ ایک فرد کی انفرادی ذمہ داری سے لے کر ایک امیر، ایک خلیفہ وقت کی ذمہ داریوں تک کو شامل ہے۔

جیسا کہ حدیث میں تفسیر کردی گئی ہے:

الامير راع والرجل راع على اهل بيته والإمراة راعية على بيت زوجها وولده فكلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته. (متفق عليه)

ترجمہ: امیر نگران ہے اور مرد نگران ہے اپنے گھر والوں پر اور عورت نگران ہے اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد پر۔ پس تم میں کا ہر ایک نگران ہے اور ہر ایک سے پوچھ ہوگی اس کی رعیت کے متعلق۔

جب انسان خلیفہ ہے تو لامحالہ اس سے مطلوب اس کے علاوہ کیا ہوگا کہ حاکم اصلی کے احکام جاری کرے اور اس کے مقاصد پورے کرے''۔ (موافقات، جلد:۲، ص:۲۳۰)

علامہ شاطبیؒ نے جو پہلو یہاں نمایاں کیا ہے اس کی رو سے احکام شرعیہ میں سے بعض کو مقصود اور بعض کو نامقصود قرار دینا ہی صحیح نہیں ہے۔ اگر بندے کا مطلوب رضائے الٰہی ہے تو اللہ کو اس کی اطاعت وعبادت اور خلافت مطلوب ہے اسی لئے مومن جب تک نیابت الٰہی کے فرض کو انجام نہیں دیتا اس کا مقصد وجود پورا نہیں ہوتا اور وہ منشائے الٰہی کی تعمیل سے قاصر رہ جاتا ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا ہے۔

مسئلہ خلافت وامارت ہندوستان میں

ہماری اوپر کی گفتگو بڑی حد تک منقح ہوگئی ہے کہ مسلمانوں کے لئے کسی امیر یا امام کی اطاعت سے آزاد ہو کر زندگی گزارنا شرعاً صحیح نہیں ہے۔ اس لئے ہندوستان میں مسلم اقتدار کے ختم ہونے کے بعد شرعی نظام قائم کرنے کے لئے انگریزی اقتدار سے کسی نہ کسی انداز میں علماء ٹکراتے رہے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز، سید احمد شہید، مولانا اسمٰعیل، مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا محمود الحسن رحمہم اللہ وغیرہ کے حالات زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے ہمیں یہ حقیقت واقعہ سمجھ میں آسکتی ہے۔

۱۹۱۴ء سے مولانا آزاد کی خواہش تھی کہ ہندوستان میں نظم جماعت کے قیام کا اعلان کر دیا جائے اور مولانا محمود الحسن کو امیر الہند بنا دیا جائے لیکن بعض وجوہ سے ایسا نہیں ہوسکا۔ مولانا آزاد کو جب اس طرف سے مایوسی ہوئی کہ پورے ملک کے لئے کوئی متفقہ متحدہ نظم قائم ہوتو پھر انہوں نے یہ ارادہ کیا کہ اصلاً صوبے وار تنظیم کا کام شروع کر دیا جائے۔ چنانچہ جب صوبہ بہار میں امیر شریعت کا انتخاب ہوا تو مولانا نے اپنی خوشی کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''میں نہیں جانتا کہ کن لفظوں میں حضرات علمائے بہار کو مبارک باد دوں کہ انہوں نے سبقت بالخیرات کا مقام حاصل کیا۔ جمعیۃ العلمائے بہار کے جلسہ میں تین سو کے مجمع علماء نے بالاتفاق اپنا امیر شریعت منتخب کر لیا۔''
> (خطبات آزاد، ص: ۱۳۷)

اس طرح ہمارے ملک ہندوستان میں امیر الہند اور امیر شریعت کے انتخاب اور دار القضاء کے قیام وغیرہ کا تصور اور کوشش کا ایک تسلسل ہے جو ملّتِ اسلامیہ ہند کی تاریخ میں پایا جاتا ہے۔ یقیناً جن ہستیوں نے جتنا بھی خون پسینہ اس راہ میں بہایا ہے اور بہار ہے ہیں وہ ان کے لئے عند اللہ بلندی درجات کا سبب ہوگا اور اس لحاظ سے خصوصاً امارت شرعیہ بہار ۱۹۲۱ء کی کارکردگی تمام مسلمانوں کے لئے قابل تقلید نمونہ ہے۔ اے کاش ہندوستان کے بقیہ سارے علاقوں میں اسی طرح کوشش کی گئی ہوتی۔ لیکن اسی کے ساتھ ہم کو اس حقیقت کا شعور ہونا چاہیے کہ مسلمانوں پر نصب امام خلافت اسلامیہ اور امارت اسلامیہ کے قیام کا جو فریضہ شرعاً عائد ہوتا ہے وہ علیٰ حالہٖ باقی رہتا ہے اور نظام کفر کے تحت امارت شرعیہ اور دار القضاء کے قیام سے وہ اصل فریضہ ادا نہیں ہوتا بلکہ اس طرح کی ساری کوشش تیمم کی حیثیت رکھتی ہے۔ جن پر اکتفاء اور قناعت کرنا صحیح نہیں ہوگا تیمم ایک عارضی اور مجبوری کی چیز ہوتی ہے۔ لہٰذا اصل کے لئے کوشش کرنا لازمی فریضہ ہوگا۔

موجودہ حالات ہجر میں جو دار القضاء بھی قائم کیا جائے گا اس کی کارکردگی کا دائرہ محدود اور نظام کفر کے تحت دی ہوئی گنجائشوں کے اندر ہوگا۔ مثلاً نکاح، طلاق اور تقسیم وراثت جیسے چند مسائل سے متعلق کوئی قاضی فیصلہ کرسکتا ہے اور اس کو بھی ملک کی عدالتوں میں چیلنج کر کے بے اثر بنایا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ اس دار القضاء کو حکومت کی سند جواز حاصل نہیں ہے۔ اس کے برخلاف جن نصوص قرآنیہ اور دلائل شرعیہ کی بناء پر ہم دار القضاء کے قیام کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کا تقاضا ہے کہ شادی بیاہ، طلاق اور تقسیم وراثت ہی نہیں بلکہ زندگی کے جملہ معاملات اور نزاعات کا فیصلہ اللہ کی نازل کردہ ہدایت کے مطابق ہو ورنہ ہم ان آیات کے مصداق قرار پائیں گے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ. (المائدہ:۴۴)

ترجمہ: اور جو اس قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا ہے تو ایسے لوگ کافر ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ. (المائدۃ:۶۰)

ترجمہ: اے نبی! کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں اس ہدایت پر ایمان لانے کا جو تم پر اور تم سے پہلے کے انبیاء پر اتاری گئی ہے اور پھر چاہتے ہیں کہ اپنے معاملہ کا فیصلہ طاغوت سے کرائیں۔ حالانکہ انہیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ طاغوت کا کفر کریں۔

کسی غیر شرعی اور غیر اسلامی نظام کے تحت جو دار القضاء بھی قائم ہوسکتا ہے اس سے وہ مقصد ہرگز پورا نہیں ہوسکتا جو دین میں مطلوب ہے اور جس کا حکم قرآن میں دیا گیا ہے۔ البتہ بہ حالت مجبوری عبوری دور کے لئے وہ کرنے کا ایک کام ہے جو کرنا چاہئے۔ شائد اللہ تعالیٰ کے نزدیک بوجہ ہماری مجبوری اور عدم استطاعت بھی مقبول ہوجائے لیکن اس کے ساتھ ہمیں خلافت اسلامیہ اور امارت اسلامیہ کے قیام کی تمنا اور حتی الوسع کوشش سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن عام طور پر دیکھا جارہا ہے کہ جو لوگ اس عبوری دور کے فریضہ کی ادائیگی کی طرف متوجہ ہیں اسی پر قانع ہوکر رہ گئے ہیں اور اس کے آگے نہ سوچتے ہیں اور نہ عملاً کچھ کرنے کے لئے تیار ہیں جو انتہائی افسوسناک واقعہ ہے۔ اس کے لئے عوام تو خدا کے پاس باز پرس سے شاید بچ جائیں لیکن خواص اور علماء جن کی نگاہ میں قرآن، حدیث وفقہ کے اصول وفروع تمام موجود ہیں وہ کس طرح بچیں گے۔

اس طرح جو لوگ خلافت اسلامیہ اور نظام اسلامی کے قیام کی بات کرتے ہیں وہ عبوری دور کے اس فریضہ کی اہمیت کو بڑی حد تک محسوس نہیں کرتے ان سے اللہ کے حضور پوچھ ہوسکتی ہے کہ تم نظام کفر وشرک کو ہٹا کر نظام شرع اگر قائم نہیں کرسکتے تھے تو محدود پیمانے پر ہی سہی تم نے اپنی استطاعت کی حد تک حکم ''بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ'' کرنے کا نظام کیوں نہیں قائم کیا۔

بہرحال دونوں کام کرنے کے ہیں ہر کام کا دین میں ایک مقام اور اہمیت ہے جس کو ہمیں سمجھنا چاہئے۔ مولانا آزاد کی ایک تحریر سے اس بات کو بڑی اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے:

''حضرات!

اب آپ مجھے اجازت دیں کہ میں مختصراً اس مسئلہ کی نسبت بھی کچھ عرض کردوں، جس کو میں علیٰ وجہ البصیرت آج تمام اعمال اصلاحیہ کے لئے بہ منزلہ اصل واساس کے یقین کرتا ہوں اور کامل بارہ سال کے مسلسل غور وفکر کے بعد اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ بغیر اس کے کبھی عقدہ کا رحل نہیں ہوسکتا۔ میرا اشارہ مسئلہ نظام و جماعت

اور قیام امارت شرعیہ کی جانب ہے۔

مسئلہ نظام جماعت سے مقصود یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اصلاح حال اور ادائے فرض شرعیہ کی استطاعت کبھی ظہور پذیر نہیں ہوسکتی جب تک وہ اپنی موجودہ حیات انفرادی کو ترک کر کے حیات اجتماعی و شرعی اختیار نہ کرلیں۔یعنی احکام نظام شرع کے مطابق سب ایک امیر و قائد شرع کی اطاعت پر مجتمع نہ ہوجائیں اور بکھرے ہوئے متفرق قومی مرکزوں کی جگہ ایک ہی مرکز قومی پیدا نہ ہوجائے۔یہی اصل اساس کار ہے اور تمام مقاصد اصلاح اور مصالح انقلاب کا نفاذ وظہور اسی کے قیام و وجود پر موقوف ہے۔

حضرات!

اسلام کے نظام اجتماعی کی شرح وتفصیل کی ضرورت نہیں علی الخصوص ایک ایسے مجمع میں جیسا کہ فضل وتوفیق الٰہی سے اس وقت میرے گردوپیش موجود ہے۔اسلام نے مسلمانوں کے تمام حیات کے لئے بنیادی حقیقت یہ قرار دی ہے کہ کسی حال میں فرادیٰ،متفرق الگ الگ اور متشتت نہ ہوں۔ ہمیشہ مجتمع۔موتلف،متحد اور نفس واحدہ ہوکر رہیں۔یہی وجہ ہے کہ قرآن وسنت میں جابجا اجتماع و وحدت پر زور دیا گیا اور کفر وشرک کے بعد کسی بدعملی سے بھی اس قدر اصرار و تاکید کے ساتھ نہیں روکا جیسا کہ تفرقہ وتشتت سے۔اور یہی وجہ ہے کہ اسلام کے تمام احکام واعمال میں یہ حقیقت اجتماعیہ بہ منزلہ محور ومرکز کے قرار پائی اور تمام دائرہ عمل اسی کے گرد قائم کئے گئے عقیدہ توحید سے لے کر تمام عبادات واعمال تک یہ حقیقت مرکزیہ جلوہ طرازی کررہی ہے۔اور اسی بناء پر بار بار نظام جماعت پر زور دیا گیا۔

علیکم بالجماعۃ والسمع والطاعۃ (الترمذی)

اور علیکم بالجماعۃ فان الشیطان مع الفذو ھو من الاثنین بعد (البیھقی)

اور اذ کان ثلاثۃ فی سفر فلیؤم واحد کم (اصحاب السنین)

اور اسی لئے نظم وقوام ملت کی منصب خلافت کو اطاعت قرار دیا گیا کہ تمام متفرق کڑیاں ایک زنجیر میں منسلک ہوجائیں۔شرح اس مقام کی بہت طولانی ہے اور معارف کتاب وسنت اس بارے میں بے شمار اور حد احصاء واستقصاء سے باہر ہیں۔رسالہ خلافت پر میں بحث کر چکا ہوں،اور زیادہ شرح وتفصیل تفسیر قرآن میں ملے گی۔

میں اس بارے میں کچھ عرض نہیں کروں گا کیونکہ گزشتہ آخری صدیوں میں مسلمانوں کا شیرازۂ اجتماع پراگندہ ہوا اور تقریباً پانچویں صدی ہجری کے بعد سے اس پراگندگی کے اسباب یکے بعد دیگرے ظہور میں آتے رہے۔ مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ بایں ہمہ تفریق و پراگندگی ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم تھی اور جب تک وہ قائم رہی نظام جماعت بھی قائم رہا لیکن اسلامی حکومت کے انقراض کے بعد مسلمانان ہند کا نظم جماعت درہم برہم ہوگیا اور سرتا سر جاہلیت کی سی بے نظمی و بے قیدی ہم پر چھا گئی۔ بلاشبہ مرکزی خلافت

آلِ عثمان کی موجودتھی اور مسلمانانِ ہند کے لئے بھی تمام مسلمانانِ عالم کی طرح وہی خلیفہ ومطاع تھے لیکن مسلمانانِ ہند کا فرض تھا کہ یا تو اپنے علائق فعلاً وعملاً پائیگاہ خلافت سے قائم کرتے اور اس کے ایک موجود و عامل نائب کی نیابت حاصل کر کے اپنے فرض اسلامی انجام دیتے اور اگر ایسا ہونا دشوار تھا اور واقعی بات یہ ہے کہ دشوار تھا اعادۂ حال اور تہیۂ کار اور ادائے فرض اسلامی میں کوشاں ہوتے۔ لیکن بدبختانہ ایسا نہیں ہوا اور جہاں غیر مسلم غلبہ واستیلاء پر محکومانہ قناعت کر لی گئی وہیں اس اولین فریضہ ملت کی طرف سے بھی ہمتوں کے قصور اور عزائم کے فقدان نے کوتاہی کی۔ بہرحال ایک زمانہ دراز اس پر گزر گیا اور اب حالت یہ ہے کہ دس کروڑ مسلمان جو تمام کرہ ارض میں سب سے بڑی یکجا اسلامی جماعت ہے جو ہندوستان میں اس طرح زندگی بسر کر رہی ہے کہ نہ تو ان میں کوئی رشتہ انسلاک ہے نہ وحدت ملت کا کوئی رابطہ۔ نہ تو کوئی قائد وامیر ہے اور نہ کوئی آمر و نافذ شرع۔ محض ایک بھیڑ ہے ایک انبوہ ہے، ایک گلہ ہے جو ہندوستان کی آبادیوں میں بکھرا ہوا ہے اور یقیناً ایک حیات غیر شرعی وجاہلی ہے جس میں یہ پوری اقلیم مبتلا ہوگئی ہے۔

اس حالت کے مفاسد وشرور میں ایک بہت بڑا مفسدہ یہ بھی ہے کہ برسوں سے ہندوستان میں شریعت کا بابِ قضاء گویا بالکل معدوم ہو گیا ہے۔ کیونکہ قضاء کا وجود بلا قاضی کے نہیں ہوسکتا اور قاضی کا وجود امارت وامامت کے قیام پر موقوف ہے۔

حضرات!

ایک منصب قضاء ہے ایک منصب امارت ہے دونوں میں عام وخاص کی نسبت ہے۔ قضاء امارت کے مقاصد میں داخل اور اس کے ماتحت ہے، مگر مقاصد امارت قضاء سے حاصل نہیں ہو سکتے، پس یہ مقاصد امارت کے فقدان کا ذکر کر رہا ہوں، صرف قضاء کا ذکر نہیں کرتا جس کے لئے محض نام نہاد قاضیوں کا تقرر یا فرضی عدالتوں کا اجراء کافی ہو۔

حضرات!

اب سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ حالت میں ہم کوئی قدم مقاصد اعمال ملیہ کا اٹھا سکتے ہیں، کیا احیائے تجدید ملت اور قیام شرح وادائے فرائض اسلامیہ کی کوئی صحیح راہ پیدا ہوسکتی ہے؟ کیا محض ایک بھیڑ اور انبوہ لے کر ہم وہ فرائض انجام دے سکتے ہیں؟ جن کے لئے اولین شرط عقلاً وشرعاً وجود جماعت منظمہ اور امارت صحیح شرعیہ ہے۔ چھوڑ دیجئے مصطلحات شرعیہ کو اگر ان سے ہمیں اس قدر بعد ہو گیا ہے کہ ساری باتوں کے لئے تیار ہیں مگر بحکم اشمازت قلوب الذین لا یؤمنون بالآخرۃ طریق شرعی اور اس کے نظام وقوام کے الفاظ سن کر یکا یک متوحش ومضطرب الحال ہو جاتے ہیں تو صرف انہی قواعد واصولوں کو سامنے لائیں جن پر آج تمام اقوام عالم عامل ہیں، میں پوچھتا ہوں کہ کیا بغیر ایک قائد اور لیڈر کے کوئی جماعت اپنی ہستی قائم رکھ سکتی ہے؟ پھر وہی حقیقت تو شریعت نے بھی لفظ امیر یا امام میں مضمر رکھی ہے۔ یہ کیا مصیبت ہے کہ اگر لیڈر کا لفظ کہا جاتا ہے تو آپ اس کا استقبال کریں اور امیر وامام کا لفظ آجائے تو نفرت واستکراہ سے بھر جائیں۔ کیا یہ وہی

غلطی نہیں جس کو راہ تاسیس اور راہ تجدید کی اصطلاح میں ابھی ابھی عرض کر چکا ہوں۔

اس کو بھی چھوڑ یئے۔ آج وقت کی سب سے بڑی مہم اور ادائے فرض شرعی کی سب سے بڑی نازک اور فیصلہ کن گھڑی ہے جو آزادی ہند اور مسئلہ خلافت کی شکل میں ہمارے سامنے آگئی ہے۔ آج ہندوستان میں دس کروڑ مسلمان ہیں جو اس وقت تک سرشار غفلت تھے اور اب آمادہ ہوئے ہیں کہ اطاعت واعانت خلیفہ عہد، حفاظت وصیانت بلاد اسلامیہ اور آزادی ہندوستان کی راہ میں اپنا اولین فرض اسلام انجام دیں۔

خدارا بتلایئے اس صورت حال میں بھی طریقہ کار کیا ہونا چاہئے اور ایسے وقتوں کے لئے آخر اسلام نے بھی کوئی نظام کار بتلایا ہے یا نہیں یا وہ باوجود دعویٰ تکمیل شرع اس قدر نامراد ہو گیا ہے کہ آج اس کے پاس وقت کی مشکل ومصیبت کا کوئی حل نہیں۔ اگر بتلایا ہے تو وہ کیا ہے یا محض انجمن سازی اور ہنگامۂ مجالس آرائی!؟ کیا محض اتباع آرائے رجال اور تقلید ارباب فن وتخمین؟ میں اعلان کرتا ہوں کہ اس بارے میں راہِ شرعی صرف وہی ایک ہے اور جب تک وہ ظہور میں نہ آئے گی ہماری کوئی سعی مشکور نہیں ہو سکتی۔

جو فتنہ آج یورپ سے اٹھا ہے چھٹی صدی ہجری میں بھی اس کے سیلاب بلا دتا تار وچین سے اٹھے تھے اور تاتاریوں کے استیلا سے تمام عالم اسلامی تہ وبالا ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی تمام بلاد شرقیہ اسلامیہ کا یہی حال تھا جو آج نظر آرہا ہے۔ لیکن اس عہد کے علماء نے پہلا کام یہ کیا کہ جن بلاد پر تاتاریوں کا قبضہ واستیلا ہو گیا تھا وہاں تنظیم جماعت اور قیام شرع کے لئے ولاۃ مسلمین کے نصب وتقرر کا حکم دیا اسی بناء پر فقہائے متاخرین کے یہاں اس کی تصریح پاتے ہو کہ بلاد محکمہ کفار میں طلب والی مسلم امارت واجب ہے۔ شیخ الاسلام احمد ابن تیمیہؒ نے انہیں بلاد محکمہ تاتار کے لئے فتویٰ دیا تھا کہ وہاں کے مسلمانوں کو ابداً اس تغیر پر قانع نہیں ہونا چاہئے اور ایک لمحہ بھی بغیر کسی امیر کے بسر نہیں کرنا چاہئے۔ یا تو وہاں سے ہجرت کر جائیں اور یا ایک امیر نصب کر کے اپنے فرائض شرعیہ انجام دیں۔''

فی الحقیقت احکام شرعیہ کی رو سے مسلمانان ہند کے لئے صرف دو ہی راہیں تھیں اور اب بھی دو ہی راہیں ہیں یا تو ہجرت کر جائیں یا نظام جماعت قائم کر کے ادائے فرض ملت میں کوشاں ہوں۔ مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے جن دو راہوں کی نشاندہی فرمائی ہے وہ کتاب وسنت، تاریخ انبیاء اور سیرت خاتم النّبیین اور دینی مسلمات کی روشنی میں فرمائی ہے۔ درحقیقت تیسری راہ یعنی اہل کفر وشرک کے مستقلاً اور بلا کراہیت ماتحت اور زیرنگیں ہو کر رہنے کی شرعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ استثنائی اور عارضی صورت حال کی بات الگ ہے کہ اس وقت ارتکاب حرام کی بھی اجازت نکل آتی ہے لیکن اس مقام پر یہ بات بھی واضح رہنی چاہئے کہ ہجرت کا مرحلہ دوسرے نمبر پر ہے۔ دینی اور شرعی زندگی گزارنے اور اشاعت دین اور غلبہ حق کے لئے راہیں جب بالکل بند ہو جائیں تو ہجرت کا سوال پیدا ہوتا ہے اس کوشش کے بغیر ہجرت کرنا فرار اور اپنی ذمہ داریوں سے گریز کے ہم معنی ہوگی جو ناقابل معافی جرم ہے۔